ڈاکٹر جہاں گیر حسن

اعظم کُریوی: حیات اور شخصیت

تلخیص

اصل نام ''انصار احمد'' اور قلمی نام ''اعظم کُریوی'' ہے۔ اِس میں ''اعظم'' تخلص اور ''کُریوی'' آبائی گاوں ''کُرئی'' کی طرف منسوب ہے۔ ''فیاض احمد'' والدِ مکرم ہیں اور ''قادر بخش'' جدِ امجد ہیں، جب کہ اسرار احمد (کریوی) اور محمد احمد دونوں بالترتیب چھوٹے بھائی ہیں۔ اعظم کُریوی اُن میں سب سے بڑے ہیں۔ خاندانی شجرۂ نسب سلسلہ سہروردیہ کے عظیم بزرگ شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی سے ملتا ہے۔ 1899ء کو ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ آبائی وطن کورئی ہے جو (پرگنہ) تحصیل چائل، ضلع کوشامبی (ضلع الہ آباد) اتر پردیش میں واقع ہے۔ ایامِ طفولیت گنگا۔جمنا کے دوآبے میں بسر ہوا۔ چوں کہ جاگیردار گھرانے سے تعلق تھا اس لیے فراخی وخوشحال کے ماحول میں بڑے ہی لاڈ۔پیار کے ساتھ پرورش ہوئی۔ ابتدائی تعلیم وتربیت گھر پر ہوئی اور آگے کی تعلیم الہ آباد اور سہارن پور کے تعلیمی اداروں میں حاصل کی۔ پھر جلد ہی ملازمت کے منسلک ہو گئے اور اِس سلسلے میں مختلف مقامات پر تبادلہ ہوتا رہا۔ 1919 میں تحریری سفر کا آغاز کیا۔ یکے بعد دیگرے ماہنامہ ''اکبر'' الہ آباد اور ماہنامہ ''طوفان'' کے مدیر رہے اور 1921-1922 میں پہلا افسانہ ''پریم کی انگوٹھی'' ماہنامہ ''طوفان'' الہ آباد میں شائع ہوا۔ بعدہٗ اعظم کریوی نے متعدد اَفسانے تحریر کیے اور اُن کے مختلف مجموعہائے افسانہ بھی شائع و ذائع ہوئے۔ گنگا۔جمنی مشترکہ تہذیب کی نمائندگی کی اور دیہات نگاری وحقیقت نگاری کو فروغ بخشا۔ 1947ء میں ہجرت کر گئے اور پاکستان میں مہاجرانہ زندگی بسر کی۔ اگر ہجرت نہ کیے ہوتے تو ہندوستانی سطح پر دنیائے فکشن میں اعظم کریوی کو وَہی حیثیت حاصل ہو سکتی تھی جو حیثیت ایک بندیا کی سہاگن کے ماتھے پر ہوتی ہے۔ کل چار شادیاں ہوئیں اور کثیر الاولاد وَاقع ہوئے۔

ابتدائی زمانہ تو بڑا ہی خوشحال اور فراخ رہا لیکن اخیر زمانہ اُسی قدر کسمپرسی کا شکار ہو گیا۔ اِن تمام کلفتوں کے باوجود اخلاق مندی، بذلہ سنجی اور لطیفانہ مزاج میں کبھی کمی نہیں آئی۔ انسان دوستی، احترام باہم اور مہمان نوازی کا دامن کبھی بھی ترک نہیں کیا۔ ضعیفی کے عالم میں بھی محنت ومشقت کا مجسمہ نظر آتے تھے۔ آخر وقت میں ماہنامہ ''عصمت'' کے لیے ایک سلسلہ ''دکھیا کی کہانی دکھیا کی زبانی'' شروع کیا۔ چوں کہ کہانی کا یہ سلسلہ حقائق پر مبنی تھا اس لیے بعض لوگوں کو یہ سلسلہ پسند نہیں آیا اور پھر ایک دن اِسی سبب ایک حملے میں 1955ء کو جاں بحق ہو گئے اور اِس طرح یہ سلسلہ نامکمل رہ گیا۔

....

نام، تخلص اور نسبتی صفت: اصل نام ''انصار احمد'' اور قلمی نام ''اعظم کُریوی'' ہے۔ اِس میں ''اعظم'' تخلص اور ''کُریوی'' آبائی گاوں ''کُرئی'' کی طرف منسوب ہے۔ ایک بار ذکر ہے کہ اُستاذ نوح ناروی نے اُن سے پوچھا: اعظم! یہ تم اپنے نام کے ساتھ ''کُریوی'' کیوں لکھتے ہو؟ اعظم کُریوی نے جواب دیا: اُستاذ! بالکل اُسی طرح جیسے آپ اپنے قصبے ''نارہ'' کی مناسبت سے ''ناروی'' لکھتے ہیں۔ اُستاذ! ایک دن آئے گا جب ''کُرئی'' دور۔دور تک مشہور ہوگا۔(1)

اُن کی یہ پیشین گوئی صد فیصد دُرست ثابت ہوئی کہ آج ''اعظم کُریوی'' ایک دمدار ستارے کی مانند فکشن کی دنیا میں چمک دمک رہے ہیں۔

آباواَجداد کے نام: ''فیاض احمد'' والدِ مکرم ہیں۔ ''قادر بخش'' جدِ امجد ہیں۔ جب کہ اسرار احمد (کریوی) اور محمد احمد دونوں بالترتیب چھوٹے بھائی ہیں۔ اعظم کُریوی اُن میں سب سے بڑے ہیں۔ 1947ء سانحے کے شکار اعظم کُریوی بھی ہوئے اور باوجودیکہ والدین سے بڑی محبت کرتے تھے برادرِ اوسط اَسرار احمد کے ساتھ پاکستان ہجرت کر گئے۔ اس کے برعکس والدِ مکرم فیاض احمد اور برادرِ اصغر محمد اَحمد نے ہندوستان میں رہنا پسند کیا۔ اس طرح اُنھیں دو سانحوں سے دوچار ہونا۔ ایک والدین کے سایۂ عاطفت سے محروم اور ایک آبائی وطن کی دردناک جدائی۔

اعظم کُریوی کو وَالدین کریمین سے کس قدر محبت تھی۔ اس کا اندازہ اِس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب بھی اُس کے پاس والدین کا کوئی خط آتا، تو

وہ اُسے پڑھنے کے بعد اَپنے بچوں کو دِیتے اور کہتے: بیٹا!''اِسے چومو، یہ تمہارے دادا۔دَادی کا خط ہے۔''(2)اعظم کُریوی اپنی اولاد کو برابر سے کہتے رہتے تھے کہ''میرا کہا بے شک ایک دفعہ ٹال جانا مگر ماں کو کچھ نہ کہنا۔''اعظم اپنے ماں۔باپ سے متعلق بہت ہی Touchy واقع ہوئے تھے۔وہ سب کچھ سن لیتے تھے اور برادشت بھی کر لیتے تھے لیکن اپنی ماں کے بارے میں بالخصوص وہ کچھ نہیں سن سکتے تھے۔(3)

خاندانی نسب نامہ: مشربی سلاسل میں قادریہ، چشتیہ، نقشبندیہ کی طرح سہروردیہ ایک اہم سلسلہ ہے۔اس کے بانی عارف باللہ شیخ شہاب الدین سہروردی قدس سرہٗ ہیں۔اسی سلسلے میں ایک مشہور ومعروف شخصیت شیخ بہاؤالدین زکریا ملتانی قدس سرہٗ گزرے ہیں جن کی خاندانی شرافت ونجابت کا ایک عالم قائل ہے، اور جن کی یادگار کے بطور''بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی''نامی ایک تعلیمی ادارہ پاکستان میں موجود ہے۔یہ عظیم الشان دانشگاہ 1975ء میں قائم کی گئی تھی۔ اعظم کُریوی کا تعلق اُسی معزز گھرانے اور خاندان سے تھا۔کُریوی خاندان کے ایک قلمی شجرے کے بموجب: شیخ بہاؤالدین زکریا ملتانی مشہور صوفی سلسلہ سہروردیہ کے رکن رکین تھے اور حسباً ونسباً پیغمبر اِسلام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان بنو ہاشم سے تعلق رکھتے تھے۔بایں سبب کُریوی خاندان بھی اور ہاشمی کہلاتے ہیں۔ اِس خاندان کا تذکرہ''منبع الانساب''اور حکیم نجم الغنی خاں رام پوری کی مشہور کتاب''آئین اُردو''میں بالتفصیل موجود ہے۔اِس خاندان کے مورث اعلیٰ (شیخ بہاؤالدین زکریا ملتانی) کا مزار مبارک ملتان (پاکستان) میں زیارت گاہِ ہر خاص وعام ہے۔(4)

یہ بابرکت اور نیک خاندان الہ آباد کے ایک چھوٹے سے گاؤں''کُرئی''میں کیسے پہنچا؟ تو اِس کی تفصیل یہ ہے کہ غیر منقسم ہندوستان کی مشہور ومعروف شخصیت اور سہروردیہ سلسلے کے عظیم بزرگ حضرت شیخ بہاؤالدین زکریا ملتانی قدس سرہٗ کے نامور نبیرہ وخلیفہ حضرت شیخ عمادالدین شاہ اسمٰعیل قریشی ہاشمی کو اُن کے علم وفضل کی بنا پر شاہانِ تغلق میں سے کسی بادشاہ نے الہ آباد میں ایک جاگیر عطا کی۔لہٰذا وہ ملتان سے الہ آباد پہنچے اور موضع بمرولی میں آباد ہوئے۔یہ موضع اِلہ آباد سے چھ میل دور مغربی طرف گنگا ندی کے داہنے کنارے پر واقع ہے۔(5) پھر آپسی اختلافات کے باعث خاندان کے کچھ افراد نے بمرولی کو خیر باد کہا اور اِلہ آباد کے مختلف علاقوں میں جا بسے۔خواجہ محمد اُسی خاندان سے متعلق تھے چناں چہ اُنھوں نے اپنے اہل وعیال کے ساتھ لب گنگا''کورئی''نامی ایک چھوٹے سے گاؤں کو اَپنا مستقل مستقر بنایا اور یہ خاندان 1947ء تک مقیم رہا۔(6)

اِس طرح سہروردی خاندان کا قافلہ جو شاہ اسمٰعیل کے ساتھ الہ آباد آیا تھا اُس کی مختلف شاخوں نے الہ آباد واطراف میں خوب پھیلا اور سیاست ومعاشرت پر اپنی علمیت وادبیت کے گہرے نقوش چھوڑے۔یہی وہ اسباب ہیں کہ اعظم کُریوی کو اپنی خاندانی نجابت وشرافت کا غیر معمولی احساس تھا۔(7) چناں چہ اِس کا اظہار وہ اِس طور پر کرتے تھے کہ''پدرم سلطان بوذ''کا نعرہ لگانا میں کچھ اچھا نہیں سمجھتا، ورنہ اپنے خاندانی بزرگوں کے تذکرے سے کئی صفحات بھر دیتا۔مختصر طور پر یہ سمجھئے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے سہروردیہ ایسے معزز خاندان کا ایک فرد ہوں۔(8)

انتباہ: قلمی شجرے کے مطابق سلسلۂ نسب شیخ زکریا ملتانی کے نامور خلیفہ اور سہروردی سلسلے کے عظیم بزرگ حضرت اسمٰعیل رحمۃ اللہ علیہ تک پہنچتا ہے جس کی تائید اعظم کریوی کے اِس دعویٰ سے ہوتی ہے: مختصر طور پر یہ سمجھئے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے سہروردی ایسے معزز خاندان کا ایک فرد ہوں۔گو یا اعظم کریوی کا خاندانی رشتہ سہروردی سلسلے کے ایک بزرگ شیخ عمادالدین شاہ اسمٰعیل ملتانی سے ہونا تو اَمر واقعی ہے جو اُن کی عظمت وشرافت کے لیے کافی ہے اور مزید کسی اضافی دلیل کی ضرورت نہیں۔لیکن اُن کا سلسلۂ نسب شیخ زکریا ملتانی قدس اللہ سرہٗ تک پہنچتا ہے اِس تعلق سے حتمی طور پر کچھ کہنا مشکل ہے اور بالکلیہ انکار بھی نہیں کیا جا سکتا ہے کیوں کہ یہ بھی امکان ہے کہ شیخ زکریا ملتانی سے شاہ اسمٰعیل ملتانی کا ارادتی تعلق ہونے کے ساتھ ساتھ نسبی تعلق بھی ہو، مگر یہ ایک گمان ہی ہے اَمر متحقق نہیں۔

خاندانی نسب نامہ درج ذیل ہے:

1۔حضرت شیخ بہاؤالدین زکریا ملتانی قدس سرہٗ

2۔حضرت شاہ اسمٰعیل (نامور نبیرہ وخلیفہ شیخ زکریا ملتانی)

3۔خواجہ محمد

4۔ بشارت علی

5۔ جان عالم

6۔ قادر بخش

7۔ فیاض احمد

8۔ انصار احمد (اعظم کُریوی)

انتباہ: خاندانی قلمی شجرے میں حضرت شاہ اسمٰعیل ملتانی کو شیخ زکریا ملتانی کا نامور خلیفہ بتایا گیا ہے اور خالد کا خط بنام حامد کمال ناروی میں شیخ عماد الدین شاہ اسمٰعیل قریشی ہاشمی کو شیخ زکریا ملتانی کا پوتا/ بھتیجہ کہا گیا ہے۔ پس اگر یہ دونوں ایک ہی ہیں تو اُن کے والد ماجد کا کیا نام ہے یہ معلوم نہیں، پھر خواجہ محمد اور شاہ اسمٰعیل کے درمیان کیا رشتہ ہے یہ بھی واضح نہیں!! حالاں کہ ہم نے خالد بن عمر کے خط پر اعتماد کرتے ہوئے شاہ اسمٰعیل ملتانی کو شیخ زکریا ملتانی کا نبیرہ فی الحال تسلیم کرلیا ہے تا آنکہ کوئی اور تحقیق سامنے نہیں آجاتی۔ اِسی لیے ہم نے ماقبل میں شاہ اسمٰعیل ملتانی کے ساتھ ''نبیرہ'' اور ''خلیفہ'' دونوں تحریر کیا ہے۔

تاریخ وسال پیدائش: اعظم کُریوی 1899ء کو ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ آبائی وطن کورئی ہے جو پرگنہ (تحصیل) چائل، ضلع الہ آباد، اتر پردیش میں واقع تھا اور ضلع کوشامبی میں واقع ہے۔(9) کورئی، بوڑھی گنگا کے کنارے ایک خوب صورت گھاٹ تھا جہاں بمشکل ساٹھ (60) گھر بستے تھے۔آج بھی یہ گاؤں، بوڑھی گنگا کے کنارے واقع ہے۔البتہ! تعلیم وتعلّم کے اعتبار سے آج کل اِس گاؤں کی حیثیت پہلے جیسے نہیں رہی۔

انتباہ: ماہنامہ ''اخبار اعظم، اعظم نمبر'' میں 22/ جون 1898ء سال وتاریخ پیدائش ہے اور مدت ملازمت میں دو سال کی توسیع کے لیے جس سرٹیفکیٹ کو درخواست کے ساتھ منسلک کیا تھا اُس میں 16/ دسمبر 1901ء مندرج ہے۔ اِس لحاظ سے دیکھا جائے تو تاریخ وسال کے سلسلے میں حتمی طور پر کچھ کہنا بڑا مشکل ہے۔لیکن چوں کہ اعظم کُریوی نے بذات خود اپنا سال پیدائش 1899ء درج کیا ہے، لہٰذا ہمارے نزدیک یہی زیادہ قرین قیاس اور درست معلوم ہوتا ہے۔ بایں سبب 1899ء کو ہی ہم نے لائق اعتبار اور درست تسلیم کیا ہے۔

کُرئی گاؤں کا محل وقوع: ''کُورئی'' گاؤں کے محل وقوع کے تعلق سے اعظم کریوی خود اپنی ایک تحریر ''میں افسانہ کیوں کر لکھتا ہوں'' میں لکھتے ہیں: میرا گاؤں کورئی، چائل پرگنہ، ضلع الہ آباد میں گنگا جی کے کنارے واقع ہے۔قریباً پانچ سال ہوئے میں الہ آباد سے لاری پر کورئی کے لیے روانہ ہوا۔ الہ آباد سے گیارہ (11) میل پر ایک گاؤں کو ئلہا رسول پور ہے، وہاں مجھے لاری سے اُترنا پڑا۔ اب کورئی پہنچنے کے لیے مجھے چھ میل پیدل چلنا تھا۔(10) گویا اعظم کریوی کا آبائی وطن شہر الہ آباد سے سترہ (17) میل کی دوری پر دریائے گنگا کے کنارے واقع ہے۔

کُرئی گاؤں کی وجہ تسمیہ: ''کورئی'' گاؤں کی وجہ تسمیہ مختلف تحریروں میں جو ہمیں ملی وہ یہ ہے کہ رام چندر جی کو جب بن باس ہوا اور اجودھیا سے روانہ ہوئے تو راجہ پور گھاٹ ہوتے ہوئے ''کورئی گھاٹ'' پر اُترے۔ یہاں سیتا جی کی انگوٹھی اُن کی انگلی سے نکل کر دریائے گنگا میں گرگئی جسے تلاش کرنے کے لیے دیوتا اور آسمانی وجود پانی میں اُترے۔ انگوٹھی تلاش کرنے کے دوران ایک جگہ بہت زیادہ کھدائی ہوگئی اور وہاں پر دریائے گنگا بہت گہرا ہوگیا، لہٰذا اُسے ''سیتا کنڈ'' کہا جانے لگا۔ نیز کھدائی کے وقت دریائے گنگا کی تہہ سے نکلی ہوئی مٹی چوں کہ اُس کے دائیں کنارے پر رکھی گئی جس سے وہاں ایک اونچی جگہ بن گئی اس لیے اُس جگہ کو پاس پڑوس کے لوگ ''کورئی'' کہنے لگے اور اِس طرح ''کورئی'' نام قرب وجوار میں ہر طرف مشہور ہوگیا۔

انتباہ: اعظم کریوی کے آبائی گاؤں کا نام متعدد تحریروں میں مختلف طریقے پر درج ہے، مثلاً: کورئی، کوری، کُرئی وغیرہ۔ ہمارے خیال سے درست اِملا ''کورئی'' ہونا چاہیے، کیوں کہ یہ لفظ ''کورائی بمعنی کھودائی'' کا متبادل ہونے سے زیادہ قریب ہے۔

عہد طفولیت اور پرورش: اعظم کُریوی کے والد فیاض احمد علاقے کے بڑے زمیندار تھے اس لیے اُن کا بچپن بڑی خوش حالی اور بے فکری میں بسر ہوا۔ چوں کہ کورئی کے ایک طرف دریائے گنگا واقع تھا اور ایک طرف کھیت۔کھلیان کی صاف وشفاف اور سرسبز فضائیں، اِس لیے اعظم کُریوی نے سیپیاں چننے کا بھی لطف اُٹھایا اور سیر وتفریح اور اُچھلنے کودنے کا بھی مزہ لیا۔ شاید اسی خوشحالی اور بے فکری نے اُن کی طبیعت میں صفت ضد کا عنصر غالب

کر دیا تھا۔ کیوں کہ اُن کے فیاض احمد جب کہیں باہر جاتے تو اعظم کُریوی زبردست چیخ وپکار مچاتے اور زمین لوٹ لوٹ جاتے کہ ہم بھی ہمراہ چلیں گے۔ چناں چہ اِن سے آ کر عاجز اُنھوں نے یہ حل نکالا کہ کہیں جانے سے دوتین گھنٹے پہلے باغ میں گھوڑی، کاٹھی اور چارہ وغیرہ بھجوادیا کرتے تا کہ اعظم کو اُن کے نکلنے کا پتا نہ چل سکے۔(11) علاوہ ازیں اعظم انتہائی جری اور دلیر ہونے کے ساتھ بلا کی قوت فیصلہ رکھتے تھے۔ایک بار فیاض احمد بُسہڑی (بسیہڑھی) شادی کی ایک تقریب میں گئے ہوئے اور اعظم بھی اُن کے ساتھ تھے۔اُس وقت اعظم کی عمر بمشکل سات سال رہی ہوگی۔لیکن غروب آفتاب کے بعد کسی کو کچھ بتائے بغیر تن تنہا کورئی واپس چلے آئے۔بسیڑھی سے کورئی دو میل کے فاصلے پر تھا۔(12) ایک اور خصوصیت جو اعظم کو اُن کے معاصر بچوں سے ممتاز کرتی ہے۔وہ ہے اُن کی حسی قوت جس کے اَثرات اُن کے افسانوں پر بخوبی دیکھے جاسکتے ہیں۔

حصول تعلیم: چوں کہ گھرانا شریف ونجیب اور تعلیم یافتہ تھا اِس لیے اعظم کریوی کی تعلیم وتربیت پر بھی خصوصی توجہ دی گئی۔تعلیم کی ابتدا گاؤں ہی سے ہوئی اور پھر مزید تعلیم کے لیے شہر کا رُخ کرنا پڑا۔(13) لہٰذا حصول تعلیم کی غرض سے اپنے ماموں احتشام الدین کے پاس سہارن پور گئے جہاں وہ پولیس انسپکٹر کی حیثیت سے تعینات تھے۔وہاں اعظم کا داخلہ ایک اسکول میں کرایا گیا۔اِسی درمیان چندن نامی ایک پنڈت دوشیزہ سے محبت کا رشتہ اُستوار ہوگیا۔جب اس کا شہرہ اہل خانہ تک پہنچا تو چندن کا اسکول جانا بند ہوگیا اور اِس کے باعث ماموں کی طرف سے اعظم کو بھی بہت کچھ سخت وسست سننا پڑا۔

کچھ عرصہ بعد احتشام الدین کا تبادلہ علی گڑھ ہوگیا تو اعظم بھی اپنے ماموں کے ساتھ علی گڑھ پہنچ گئے۔لیکن ابھی چند ہی دن ہوئے تھے کہ الہ آباد لوٹ گئے اور آگے کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے اعظم کا داخلہ بورڈنگ اسکول میں کرادیا گیا۔(14) الہ آباد ہی میں انٹر پاس کیا اور ایف۔اے۔میں داخلہ لیا لیکن ابھی ایف۔اے۔کورس کا دوسرا سال ختم نہیں ہونے پایا تھا کہ تعلیمی سلسلہ منقطع ہوگیا اور ملازمت کی طرف مائل ہوگئے۔

عہد ملازمت: آثار وقرائن بتاتے ہیں کہ اعظم کریوی نے اپنی ملازمت کا آغاز کلرک سے کیا۔اولین دفعہ وہ سہارن پور کے ایک سرکاری دفتر میں بحیثیت کلرک ملازم ہوئے۔یہاں ایک بار پھر چندن سے ملاقات ہوئی اور پُرانی یادیں تازہ کیا ہوئیں کہ محبت آمیز خط وکتابت کا دور شروع ہوگیا۔لیکن جب اِس معاشقے کی بات چندن کے قریبی رشتے داروں تک پہنچی تو وہ اعظم کی جانی دشمن ہوگئے۔1916ء میں میرٹھ چلے گئے اور 1920ء تک وہاں قیام پذیر رہے اور میرٹھ سے ہی سال 1919ء میں اُن کے رومانی خطوط پر مشتمل ایک مجموعہ ''پریم پتر'' کے نام شائع ہوا۔اِس کے بعد الہ آباد واپسی ہوئی اور یکم ستمبر 1921ء کو الہ آباد کے ایک فوجی ادارے میں عارضی سویلین کلرک کے طور پر بحال ہوئے۔18/مئی 1922ء کو مستقل کلرک بنائے گئے اور 18/اکتوبر 1926ء تک الہ آباد میں ہی رہے۔

یہی وہ زمانہ ہے کہ اعظم کریوی ''ماہنامہ طوفان'' الہ آباد کی ادارتی بورڈ سے منسلک ہوئے اور نوح ناروی کی سرپرستی میں نکلنے والے اِس ماہنامے کے مدیر قرار پائے اور اِسی میں اُن کا پہلا افسانہ ''پریم کی انگوٹھی'' شائع ہوا۔

الہ آباد سے تبادلہ ہوا تو کوئٹہ چلے گئے اور 19/اکتوبر 1926ء سے 19/اکتوبر 1928ء تقریباً دو سال تک جبل پور میں تعینات رہے۔اِس کے بعد بھی مختلف مقامات پر تبادلہ ہوتا رہا۔لیکن ایک بار پھر میرٹھ جا پہنچے اور 12/اپریل 1941ء سے 22/دسمبر 1942ء تک ہیڈ کوارٹرز میرٹھ ڈسٹرکٹ کے ویٹری برانچ کے سپرنٹنڈنٹ کے عہدے پر مامور ہوئے اور اِس درمیان کچھ دنوں کے لیے ''دہرہ دون'' میں بھی تعینات رہے۔

اعظم کریوی کے لیے 1928-1942ء کا زمانہ تحریر وتالیف کے لحاظ سے بڑا زرخیز معلوم ہوتا ہے، مثلاً:

1۔زمانہ، نگار، الناظر، عصمت، مخزن، ہمایوں وغیرہ مشہور ومعروف رسائل میں اعظم کے افسانے شائع ہوئے۔

2۔اُن کی مختلف کتابیں منظر عام آتی ہیں، مثلاً: ایک کتاب ''ہندی شاعری'' 1931ء میں کتابستان، الہ آباد سے شائع ہوئی اور ایک کتاب ''دیہاتی گیت'' 1939ء میں ہندوستانی اکیڈمی، الہ آباد سے شائع کی گئی۔جب کہ اُن کا اولین افسانوی مجموعہ ''پریم کی چوڑیاں'' 1942ء میں شائع ہوا۔اِس زمانے میں اعظم کریوی رسالہ ''اکبر'' کے شعبۂ ادارت سے بھی منسلک رہے۔

اس کے بعد سال 1942-1943ء میں چھ-سات مہینے کے لیے بنگال میں تعینات رہے، پھر اَنبالہ چلے گئے اور 1943ء سے 23/نومبر

1947ء تک انبالہ / سیاتھو میں رہے۔ یہی وہ زمانہ ہے کہ کافی جد وجہد اور عملِ پیہم کے بعد ہندوستان کو آزادی ملی اور تشکیل پاکستان عمل میں آئی۔

1924۔1947ء کا عہد افسانہ نگاری کے اعتبار سے انقلابی ثابت ہوا کہ اِس دوران تقریباً چھ افسانوی مجموعے منظر عام آئے۔ مثال کے طور پر ''شیخ و برہمن'' اور ''دکھ سکھ'' یہ دونوں مجموعے 1943ء میں، ''انقلاب'' اور ''کنول'' یہ دونوں مجموعے 1944ء میں، ''ہندوستانی افسانے'' اور ''روپ سنگھار'' یہ دونوں مجموعے 1945ء میں یکے بعد دیگرے شائع ہوئے۔

تقسیم ہند کے بعد پاکستان ہجرت کر گئے، وہیں سرگودھا میں ملازم بحال ہوئے اور 24/نومبر 1947ء سے 29/دسمبر 1947ء تک رہنے کے بعد وہاں سے اُن کا تبادلہ راولپنڈی کر دیا گیا۔ یہاں وہ 30/دسمبر 1947ء سے 9/اگست 1948ء تک ہیڈ کوارٹر ڈویژن: 7 میں تعینات رہے، پھر 10/اگست 1948ء سے 28/اگست 1948ء تک انٹر سروس پبلک ریلیشن ڈائریکٹریٹ منسٹری آف ڈیفنس راولپنڈی میں خدمات انجام دیں۔ اِس کے بعد ملیر کینٹ تبادلہ ہو گیا، جہاں اعظم نے ہفتہ واری اخبار ''مجاہد'' کے مدیر رہے اور 29/اگست 1948ء سے 17/مئی 1949ء تک منصب ادارت سے وابستہ رہے۔ کچھ دنوں تک انگریزی اخبار ''اسٹینڈرد'' پاکستان کے ایڈوٹوریل شعبے میں بھی کام کیا، اور بالآخر اپنی ملازمت کی تیس سالہ مدت پورا کرنے کی بعد ریٹائر ہو گئے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد بھی وہ وقفے وقفے سے کچھ عرصے تک سرکاری، نیم سرکاری اور پرائیویٹ اداروں میں ملازمت کرتے رہے۔ مثلاً: ایک فرم ''یونائیٹڈ نیشنز'' کے دفتر میں کچھ عرصہ تک کام کیا اور کچھ دنوں تک حفیظ جالندھری کے پرائیویٹ سیکریٹری بھی رہے۔ جب کہ ضمیر جعفری کے ایک مضمون ''ڈاکٹر اعظم کُریوی کے ساتھ دو سال'' مشمولہ ماہنامہ ساقی کراچی، نومبر 1955ء، ص: 31 سے انکشاف ہوتا ہے کہ اعظم نے ریٹائرمنٹ کے بعد بھی 1953ء تک ''مورال بلڈنگ محکمے'' میں اُن (جعفری) کے ماتحت کام کیا۔

پاکستان ہجرت کر جانے کے بعد اعظم کریوی کی افسانہ نگاری میں کمی آ گئی تھی اور فقط چند گنے چنے افسانے ہی لکھ پائے۔ اُن میں ایک افسانہ ''مہاجر کی عید'' اور ایک کہانی کا سلسلہ ''دکھیا کی کہانی میری زبانی'' قابل ذکر ہے۔ ''دکھیا کی کہانی میری زبانی'' کے عنوان سے ایک سلسلہ وار کہانی ماہنامہ ''عصمت'' کراچی کے لیے شروع کیا تھا لیکن زندگی نے وفا نہیں کی اور مذکورہ کہانی کا یہ سلسلہ پانچ کے عدد پر ہی رُک گیا۔

ازدواجی زندگی: اعظم کُریوی نے یکے بعد دیگرے کل چار شادیاں کیں، بیویاں اور اُن سے ہونے والی اولاد کی تفصیل حسب ذیل یہ ہے:

بیویاں/ زوجات

1۔ خلیق النساء: یہ قریبی رشتے دار کی دختر تھی جس سے کُریوی کی پہلی شادی ہوئی، لیکن اُن کی پہلی بیوی زیادہ دنوں تک زندہ نہیں رہ سکی۔

2۔ چندن عرف چاند سلطانہ: چندن سے شادی کیسے ہوئی؟ اس کی تفصیل جاننے کے لیے افسانہ ''کنول'' پڑھنا مناسب رہے گا۔ ہمارے خیال سے اعظم کریوی کی آپ بیتی کا مطالعہ افسانہ ''کنول'' میں بخوبی کیا جا سکتا ہے۔

3۔ نام معلوم نہیں: یہ افتخار احمد کی والدہ ہے، اعظم کُریوی نے جب اِن سے نکاح کیا تھا تو غالباً یہ بیوہ تھی۔

4۔ خیر النساء بیگم: (تفصیل ندارد)

اولاد امجاد

بیٹے:

1۔ اسلم: یہ خلیق النساء کے بطن سے پیدا ہوا، اور ہندوستان ہی میں سکونت اختیار کی۔

2۔ مہتاب احمد: یہ چندن عرف چاند سلطانہ کا بیٹا تھا جو 22/سال کی عمر میں قیام میرٹھ کے دوران نہر میں ڈوب کر اِنتقال کر گیا۔ اِس کی موت کا اثر اعظم پر کافی گہرا پڑا، جس کی وجہ سے کچھ دنوں تک وہ کافی اضطراب و پریشانی میں بھی رہے۔

3۔ افتخار احمد (تیسری بیوی کے بطن سے)

4۔ نیر اعظم (تیسری بیوی کے بطن سے)

5۔ سلیم اعظم (چوتھی بیوی خیر النساء کے بطن سے)

6۔خالد اعظم (چوتھی بیوی خیر النساء کے بطن سے)

8۔عزیز احمد (تیسری بیوی کے پہلے شوہر سے)

8۔حبیب احمد (تیسری بیوی کے پہلے شوہر سے)

بیٹیاں:

چندن عرف چاند سلطانہ سے تقریباً سات بیٹیاں پیدا ہوئیں مثلاً:

1۔خورشید سلطانہ　　2۔اختر سلطانہ

3۔قمر سلطانہ (یہ کوئٹہ میں پیدا ہوئی اور صرف آٹھ ماہ زندہ رہی)

4۔ثریا سلطانہ　　5۔نجمہ سلطانہ

6۔شمع سلطانہ　　7۔ناہید اعظم

تیسری بیوی سے تین بیٹیاں پیدا ہوئیں جن کے نام یہ ہیں:

8۔زینت النساء　　9۔تہذیب النساء　　10۔فرحت یاسمین

خیر النساء سے دو بیٹیاں پیدا ہوئیں جن کے نام یہ ہیں:

11۔صالحہ　12۔صبوحی (صبیحہ،صبی)(15)

گویا ڈاکٹر اعظم کُریوی کی تقریباً 20 / اولاد ہوئیں جن میں 8 / لڑکے اور 12 / لڑکیاں شامل ہیں۔

وفات: اعظم کریوی جو کبھی انتہائی عیش و عشرت کی زندگی بسر چکے تھے آخری عمر میں اُنھیں کافی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔لیکن اُن کی پیشانی ذرہ برابر بھی شکن آلود نہیں ہوئی۔ملازمت سے سبکدوشی کے بعد ایک بار پھر کہانی لکھنے کی طرف مائل ہوئے اور سچی کہانی پر مشتمل ایک سلسلہ ''دکھیا کی کہانی'' کے نام شروع کیا اور ابھی اُس کے غالباً چار پانچ سلسلے ہی شائع ہوئے تھے کہ اُسی کہانی کے سبب جان لیوا حملہ ہوا اور 1955ء میں اس دنیا کو خیر باد کہہ دیا۔

شخص و عکس: اعظم کریوی کے اوراق حیات پلٹنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اعظم کی شخصیت تضادات کا مجموعہ ہے۔ایک طرف احباب و متعلقین اُنھیں تیز مزاج،غصیلے،کھردری طبیعت کا مالک بتاتے ہیں تو دوسری طرف اصدقا اُنھیں نازک مزاج،زندہ دل،بذلہ سنج،ہمدرد اور دوست نواز شخصیت کہتے ہیں۔مثلاً برادر اوسط اسرار احمد کریوی اپنے مضمون ''ذکر اعظم کریوی''میں لکھتے ہیں کہ ضدی طبیعت پائی تھی اور تیز غصہ والے تھے۔(16) یہاں تک کہ اپنے غصے کی تیزی کے باعث انگریز وغیرہ کو گالی دینے اور انگریز افسروں کو پیٹنے سے بھی دریغ نہیں کرتے تھے۔بایں سبب وہ ترقی نہ کر سکے جب کہ اعظم کے ساتھی نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔فوج میں اُن کی ترقی نہ ہونے کی وجہ صرف اُن کا غصہ تھا۔(17) اس کے برعکس ایک مراسلہ جو اعظم کریوی نے 1934ء کے اخیر میں ''نیرنگ خیال'' لاہور کے ایڈیٹر کو لکھا تھا اُس کے بموجب: اعظم بڑے نازک مزاج اور جذباتی معلوم ہوتے ہیں۔مراسلہ میں درج ہے کہ شور و غل سے بہت گھبراتا ہوں۔دل پر کسی خاص واقعہ یا نظارہ کا اثر ہوا کہ میں تنہائی میں افسانہ لکھنے بیٹھ جاتا ہوں،اس عالم میں اگر میرے کسی کرم فرما نے پکارا،یا میرے بچوں نے شور مچایا تو پھر لاکھ کوشش کرنے پر بھی اس وقت اپنے افسانے کو مکمل نہیں کر سکتا۔چناں چہ اس نقص کی وجہ سے سال میں دو چار ہی اوریجنل افسانے لکھ پاتا ہوں۔(18)

اعظم کُریوی اپنے والدین کے بڑے چہیتے،لاڈلے اور پیارے تھے،اور اِس کی اصل وجہ یہ تھی کہ اِس سے پیشتر فیاض احمد کی جو بھی اولاد ہوئیں وہ زندہ نہیں رہ سکیں۔اگر اعظم کُریوی باحیات رہے تو اِس لیے کہ اُن کے والدین نے کسی بزرگ سے اُن کے لیے دعا کرائی تھی جسے اللہ تعالیٰ نے شرف قبولیت بخشا۔غالباً بزرگ ہی کی دعا کا اثر تھا کہ وہ اقربا پروری اور انسان دوستی کی مثال تھے۔کیوں کہ اپنے عزیز واقارب سے اُنھیں بڑی محبت تھی۔گاؤں کے غریب غربا سے خلوص کے ساتھ ملتے تھے اور گاؤں کے لوگوں کی بڑی عزت کرتے تھے۔چھوٹی ذات کے ہندوؤں،مثلاً: چمار،پاسی،گوالے اور دوسرے غریب لوگوں کے پاس بیٹھ کر اُن کا دکھ۔درد بانٹا کرتے تھے۔(19) لیکن اُن کی شخصیت کا یہ پہلو بڑا ہی حیرت انگیز ہے کہ وہ اپنے

اعزہ واقارب کی عزت کرنے اور اُن سے حد درجہ محبت رکھنے کے باوجوداَپنے بیٹوں کو رِشتے داروں سے دوری بنائے رکھنے کی تاکید وتلقین کرتے تھے۔ بقول افتخار احمد: والد صاحب مجھ کو سمجھاتے تھے کہ رشتے داروں سے اور خاندان والوں سے کوئی تعلق نہ رکھنا، خاندان میں رشتہ دینا نہ رشتہ لینا۔ یہی تمہارے حق میں بہتر ہے۔ وہ دادا کے علاوہ کسی سے نہیں ملاتے تھے(20)اور اِس کی خاص وجہ یہ تھی کہ اعظم کریوی اپنے خاندان والوں سے اُن کی بعض غلط حرکات کے باعث بدظن تھے، کیوں کہ والد صاحب کا کہنا تھا کہ رشتے دار دھوکے باز ہیں۔ اُنھوں نے جعلی شجرے بنائے۔ یہ اپنے کومقید کرنا ہے اور یہ اسلامی تعلیمات کے بھی خلاف ہے۔(21)لیکن اِن سب باتوں کے باوجود خاندان کے بڑوں کی عزت اور اُن سے محبت رکھنے پر کوئی حرف نہیں آتا، کیوں کہ یہ تو اور بھی اچھی بات ہے کہ اتنا کچھ ہونے کے بعد بھی وہ اپنے خاندان کے بڑوں کی عزت اور اُن سے محبت کرتے رہے۔ پھر رہ گئی یہ بات کہ اپنے بچوں کو اُن سے دوری بنائے رکھنے کی تاکید وتلقین کی تو میرے خیال میں اس کی تین صورتیں ہوسکتی ہیں:

1۔ اہلِ خاندان کی غلط حرکتوں کے سبب اُن کے بچوں کو کوئی نقصان نہ ہو۔

2۔ اُن کے بچے خاندان والوں کی بے عزتی نہ کردیں۔

3۔ یا وہ رسم ورواج توڑنا چاہتے تھے جو خاندان والوں نے اپنا رکھا تھا کہ شادی بیاہ خاندان سے باہر نہیں ہونی چاہیے۔

کیوں کہ وہ خاندانی حد بندیوں پر یقین نہیں رکھتے تھے، اُنھوں نے بعد میں جو تین شادیاں کی وہ بھی خاندان سے باہر ہی کی تھیں۔

جناب ضمیر جعفری جو 1953ء میں ''مورال بلڈنگ محکمے'' کے تحت ملازمت کے دوران ساتھ رہے، وہ ڈاکٹر اعظم کُریوی سے بہت متاثر تھے اور اُن کی پرکشش اور انسان دوستی شخصیت سے کافی مرعوب ومتحیر بھی تھے۔ اپنے مضمون ''ڈاکٹر اعظم کُریوی کے ساتھ دوسال'' میں وہ لکھتے ہیں کہ ڈاکٹر اعظم کریوی کی شخصیت اور کردار کو اگر ایک لفظ میں بیان کرنا چاہوں تو وہ لفظ ہے ''حیرت انگیز''۔ کیوں کہ اُن کی زندگی کا جو بھی گوشہ سامنے آیا اُسے حیرت انگیز پایا۔(22)1951ء میں ملیر کینٹ کے محکمہ ''مورال بلڈنگ'' میں اُن کا تقرر ہوا تو حفیظ جالندھری کے توسط سے اُنھیں پہلی بار دیکھنے کی مسرت حاصل ہوئی۔ دفتر میں تو دونوں ساتھ ساتھ رہتے ہی تھے، رہائش بھی پاس پاس ہونے کی وجہ سے جلد ہی ہم دونوں میں کافی اخلاص پیدا ہوگیا۔ دفتر اور گھر قریب قریب تھا اِس لیے بسا اوقات ہم لوگ شام کا کھانا بھی دفتر ہی میں منگوالیا کرتے تھے۔(23)محکمانہ تعلقات بہت جلد دوستانہ محبت میں ڈھل گئے۔ ہم لوگ کسی مشترکہ دفتر کے کارکنان سے زیادہ دکھ سکھ کے شریک اور ایک کنبے کے افراد معلوم ہوتے تھے۔ مرحوم کے الفاظ میں مرشد، ڈاکٹر صاحب اور بھائی صاحب!(24)دفتر سے اُٹھتے تو حفیظ جالندھری کے یہاں جا بیٹھتے اور ظاہر سی بات ہے کہ اس حالت وکیفیت میں ڈاکٹر صاحب سے بے تکلف ہوئے بغیر میرے لیے کوئی چارہ نہ تھا۔ اگر کبھی عمر میں فرق کے باعث میں کچھ فاصلہ قائم کرنے کی کوشش بھی کرتا تو وہ آگے بڑھ کر مجھے اپنے سینے سے لگا لیتے۔ حجاب وتکلف کے وہ سخت مخالف تھے۔ دفتر میں مجھ سے پہلے ہی روز کہنے لگے کہ میں تو آپ کو بھائی کہا کروں گا اور فی الحقیقت میرے ساتھ اُن کا سلوک ہمیشہ بڑے بھائی کا سا رہا۔(25)

اعظم کُریوی کے مزاج وشخصیت سے متعلق اپنے ایک مکتوب بنام حامد کمال ناروی، مورخہ 3/اگست 1922ء میں ضمیر جعفری لکھتے ہیں کہ میں نے اپنی زندگی میں دو بیویوں والے کو اتنا بذلہ گفتار اور اِتنا بےفکرا کسی کو اَور کبھی نہیں دیکھا۔(26)اور شاہد احمد دہلوی اپنا مجموعی تاثر یوں دیتے ہیں کہ اعظم کریوی ایک عجیب وغریب انسان تھے۔(27)

اعظم کریوی نے کچھ دنوں تک لکھنو میں بھی قیام کیا جہاں اُن کی ملاقات ڈاکٹر عبادت بریلوی سے ہوئی۔ اِس ملاقات میں اُنھوں نے اُن کو کیسا پایا، اپنے ایک مکتوب بنام حامد کمال ناروی، ۱۶/دسمبر ۱۹۹۲ء میں لکھتے ہیں کہ ڈاکٹر اعظم کریوی کے بارے میں میری معلومات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ وہ ایک زمانے میں لکھنو تشریف لائے تھے اور چند ماہ اُن کے ساتھ میں نے گزارے لیکن ان کی شخصیت بہت عجیب تھی، اتنی عجیب کہ میں ان کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اُن سے میری ملاقاتیں رہیں لیکن اب میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ وہ کیسے آدمی تھے۔ میں نے ہمیشہ اُنھیں اچھا دوست پایا۔ دانش محل میں روزانہ تشریف لاتے تھے اور اُن سے روزانہ ملاقاتیں ہوتی تھیں۔(28)

ڈاکٹر اعظم کُریوی ملازمت سے سبکدوشی کے بعد جب وہ تقریباً 50/52 سال کے تھے اُس وقت بھی نہایت محنت، مستعدی اور ایمانداری سے

اپنی ذمے داری ادا کرتے تھے۔مختلف النوع مصائب ومسائل میں گھرے ہونے کے باوجود اُنھوں نے کبھی بھی اپنے فرائض منصبی سے سمجھوتہ نہیں کیا اور نہ اپنے معمولات میں کبھی کوئی رُکاوٹ آنے دی۔ریٹائر ہونے سے چند سال پہلے اخراجات کی کثرت اور وسائل کی کمی سے ہجوم افکار نے اعظم کریوی کا حلیہ بگاڑ دیا تھا۔وہ پہلے کی طرح اب تنومند تو نہیں تھے لیکن ان کے حوصلے پوری طرح پست نہیں ہو سکے تھے اور اُن کی فرض شناسی اور فرض کی ادائیگی متاثر نہیں ہو سکی تھی۔(29) معمولات کے اتنے بڑے پابند تھے کہ ایسے انسان میں نے اپنی زندگی میں بہت کم دیکھے ہیں۔احساس فرض کا جذبہ اس قدر شدید تھا کہ ان کی زندگی ایک سزا بامشقت معلوم ہوتی۔پاسبان عقل ہر وقت دل پر مسلط۔(30) 1951ء میں وہ پنشن کی حد پر جا پہنچے تھے۔زندگی کچھ اس بیدردی سے ان کے اوپر سے گزری تھی کہ وہ اپنی عمر سے بھی کوئی پندرہ برس زیادہ معمر نظر آتے تھے۔رخسار پچک گئے تھے۔ہڈیاں ابھر آئی تھیں۔دبلے پتلے، لاغر و کمزور، آنکھیں اندر کو کہیں اتنی دور چلی گئی تھیں کہ چہرے پر ناک ہی ناک رہ گئی تھی۔مگر اِس کے باوجود بلا کے مستعد تھے۔غضب کے چوکس و چوبند اور کارفرما و کارکشا۔دیکھنے میں وہ تکان کا مجسمہ دکھائی دیتے تھے مگر تھکنا وہ جانتے ہی نہ تھے۔وہ اس مقام پر تھے جہاں تکان خود تھک کر بیٹھ جاتی ہے۔(31) اُن کی گھریلو زندگی کا پھیلاؤ اُن کے وسائل و آمدنی کے بس کا روگ نہ تھا۔معاملات الجھے ہوئے بھی تھے مگر یہ ناممکن تھا کہ محض ان کی کاہلی یا بے پروائی کے سبب کوئی معاملہ اُلجھنے پائے یا دیر تک الجھا رہے۔جس وقت اُن کو جس مقام پر ہونا چاہیے وہ وہاں ضرور ہوتے۔(32) اور ایسے عالم میں اگر اُن کا کوئی سچا ہمدرد و غمگسار تھا تو وہ تھی اُن کی بوسیدہ سی بائیسکل، جو زندگی کے تمام مشکلات میں اُن کے ساتھ ساتھ رہی اور تمام طرح کے فرائض منصبی کی ادائیگی میں اُن کی مدد کرتی رہی۔مثال کے طور پر اپنی تمام تر ذمے داریاں اور گھریلو کام کاج اسی بائیسکل پر سر انجام دیتے تھے اور بائیسکل بھی اسی طرح چلاتے تھے جیسے کوئی بیمار گھوڑ الداہوا تانگہ گھسیٹ رہا ہو۔(33)

گویا اعظم کُریوی کی حیات کا ابتدائی دور جس قدر آسودہ حالی میں بسر ہوا، اس کے برعکس اُن کی زندگی کا آخری دور کسمپرسی اور تنگ حالی میں گزرا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اُنھوں نے بچپنے میں گھوڑی اور کاٹھی کی شاہی سواری کا لطف اُٹھایا تو ضعیفی میں اُنھیں ٹوٹی پھوٹی اور کھٹارا بائیسکل کی رفاقت برداشت کرنی پڑی۔وہ خود کو مصروف رکھنے میں یقین رکھتے تھے اور خالی بیٹھنا اُنھیں سخت ناگوار تھا۔بقول ضمیر جعفری: ملیر سے ڈیوٹی ٹرک لے کر ہم لوگ جب کبھی کراچی جاتے تو اعظم اپنی بائیسکل بھی اُسی میں رکھ لیتے، جہاں ٹرک نہ جاسکتا وہاں وہ بائیسکل پر ہوآتے۔بازار میں اچھے بھلے چلتے چلتے اچانک معذرت کر کے یکبارگی غائب ہوجاتے۔پھر اللہ معلوم کہاں کا چکر کاٹ کر اچانک کسی موڑ پر آن ملتے۔گویا ابھی تھے ابھی نہیں ہیں۔آرام اُن کی سرشت ہی میں نہ تھا۔دوستوں کی بے تکلف صحبتوں میں ان کی گفتگو پر بھی مشقت کا گمان ہوتا۔اعظم کو میں نے آرام سے فارغ بیٹھا کبھی نہ دیکھا۔بعض اوقات گمان ہوتا کہ فارغ بیٹھنے سے اُنھیں شدید تکلیف ہوتی تھی۔دفتر تو خیر دفتر تھا، گھر پر بھی جب ملے تو ہمیشہ مصروف ملے، کبھی چارپائی کا بان ادھیڑ رکھا ہے۔کبھی دھوتی باندھے گھر کی صفائی میں جٹے ہیں۔کبھی نواسے، نواسوں کے حلقے میں بیٹھے باتیں کررہے ہیں۔کچھ نہیں کر رہے ہیں تو بائیسکل پر چڑھے کسی طرف ہی چلے جارہے ہیں۔(34) اُن کے پاس گھریلو ذمہ داریوں کی کبھی نہ ختم ہونے والی ایک لمبی لسٹ ہوتی تھی اور کب کیا انجام دینا ہے وہ سب اُن کی ٹیبل ڈائری میں مندرج رہا کرتے تھے، مثلاً: ۶ رتاریخ کو اِفتخار کی فیس، ۹ رکو یویو کا امتحان، ۱۲ رکو مارٹن روڈ پر لکڑی، ۱۵ رکو لاڑکانہ حساب، ۲۰ رکو بڑی بیگم کے گھی، ۲۴ رکو بچوں کو لے جانا وغیرہ وغیرہ۔(35) پھر بھی وہ بڑے اطمینان وسکون سے اپنے کام میں مصروف رہتے اور بڑی سے بڑی ذمہ داری کو بھی اپنے اوپر حاوی نہیں ہونے دیتے۔گویا اعظم کُریوی کی شخصیت ایک ایسے مضبوط مجسمے کی طرح تھی جو بادِ باراں کی تند یورشوں کو خاطر میں نہیں لاتی اور اپنی جگہ اٹل رہتی ہے۔(36)

بحیثیت سوشل ورکر: چوں کہ اعظم کُریوی کا آخری زمانہ کسمپرسی اور کلفت میں گزرا اِس لیے وہ سامنے والے کا دکھ درد بخوبی سمجھتے تھے۔بنابریں دوسروں کے دکھ۔درد میں کام آنا وہ اپنا فرض منصبی جانتے تھے، اور پیرانہ سالی میں لوگ عام طور پر آرام طلب واقع ہوتے ہیں بلکہ ایک گلاس پانی کے لیے بھی کسی نہ کسی کی مدد کے طالب ہوتے ہیں، لیکن اعظم کی شخصیت اِس اعتبار سے منفرد اور قابل رشک نظر آتی ہے کہ وہ نہ صرف اپنے گھریلو کام۔کاج بذات خود کرنے میں فرحت وانبساط محسوس کرتے تھے بلکہ دوسرں کے کام آنے میں بھی اُنھیں یک گونہ فرحت وسرور کا احساس ہوتا تھا۔وہ اکثر آتے جاتے اپنے آس۔پاس والوں سے پوچھتے کہ کسی کو کچھ منگانا تو نہیں ہے؟ یہاں تک کہ کبھی کبھی تو پڑوس کے کچرے بھی خوشی خوشی باہر پھینک آتے تھے۔

یہاں تک کہ۔نماز کے لیے جاتے ہوئے بھی وہ کپڑا وغیرہ مانگ کرلے جاتے تھے۔(37)اور اِسی بس پر نہیں تھا بلکہ خانہ داری کے انتظام وانصرام میں اُن کی مشق ومہارت کا یہ عالم تھا کہ از راہِ محبت اپنی ہم پیشہ ضمیر جعفری کے بعض گھریلو انتظامی اُمور بھی اُنھوں نے اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا۔(38)

یہی وہ انسانی جذبہ تھا جو اعظم کریوی کو کام، کام اور صرف کام میں مصروف کررکھا تھا ممکن ہے کہ وہ اس میں یقین رکھتے ہوں کہ ''زمین کے اوپر کام اور زمین کے نیچے آرام''۔ یہ گمان اس طور پر بھی یقین میں بدل جاتا ہے کہ اُنھوں نے جو بھی کام کیا وہ نہایت انہماک اور لگن کے ساتھ کیا، چاہے وہ گھریلو اُمور ہوں، چاہے انسانی جذبے کے تحت کوئی کام، یا پھر دفتری امور ہوں۔ یہاں تک کہ کبھی کبھی تو دفتر کا وقت ختم ہو جاتا پھر بھی وہ دفتری کاموں میں مشغول رہتے اور بقایا کاموں کو نبٹاتے رہتے۔یعنی دفتر کا وقت ختم ہو چکا ہوتا اور حفیظ صاحب آوازیں دے رہے ہوتے کہ ڈاکٹر صاحب آیئے! دن بھر کی محنت کے بعد اَب کچھ گپ شپ ہو جائے مگر وہ ہیں کہ اب نئے سرے سے دفتر کھول کر بیٹھ گئے ہیں۔ بڑی سنجیدگی سے جواب دیتے: مرشد! مجھے ابھی معذور ہی سمجھئے، بہت کام بقایا پڑا ہے۔آپ افسر سہی، محکمہ تو مجھی کو چلانا ہے۔کام نہ ہوتا تو پیدا بھی کر لیتے، حفیظ صاحب دفتری ڈرافٹوں میں شعر کی جامعیت کے قائل تھے اور ڈاکٹر صاحب افسانوی پھیلاؤ کے، اُن کی کوشش ہوتی کہ ڈرافٹ مرزا غالب کی غزل ہو، اِن کی کوشش ہوتی کہ ڈرافٹ میں تمہید، پلاٹ، مرکزی خیال، نقطۂ عروج سب کچھ ہو۔نتیجہ یہ نکلتا کہ کام پیدا ہوتا رہتا۔(39)اور ایک دن آخر وہی ہوا جو ہونا تھا کہ اعظم کریوی کی صحت بگڑنے لگی، کیوں کہ قوت برداشت سے زیادہ کام کا اثر صحت پر تو پڑنا لازمی تھا،لہٰذا وہ چوطرفہ مسائل ومشکلات، مثلاً:ضعف ونقاہت، کثرت کار، مالی پریشانی اور سیاسی افراتفری کے شکار ہوئے بغیر نہ رہ سکے،لیکن ایسے عالم میں بھی انھوں نے خود کو قابو میں رکھا اور حالات کی سنگینی کے سامنے گھٹنے ٹیکنے کے بجائے جہد مسلسل اور عمل پیہم کو اَپنا شعار بنائے رکھا۔حالاں کہ اخیر سال میں صحت کمزور، آمدنی قلیل، تین چار کنبوں کی کفالت کے باعث اعظم کا رنگ مرنے سے پیشتر ہی زرد ہو چکا تھا۔نہ جانے وہ زندگی کے کتنے محاذوں پر لڑرَہے تھے مگر زندگی کے سامنے ہتھیار ڈالنے پر ہرگز آمادہ نہ تھے۔جس جس طرح کی مادّی وذہنی پریشانیوں میں گھرے ہوئے اُنھیں دیکھا گیا، اگر کوئی اور ہوتا تو مدتوں پہلے گھٹنے ٹیک دیتا مگر وہ برابر لڑتے جارہے تھے۔(40)اوپر سے ہجرت اور مہاجر ہونے کے باعث اُن کی پریشانیوں میں اور اِضافہ ہوتا چلا گیا۔اُس پر ملازمت سے سبکدوشی نے رہی سہی اُن کی کمر بھی توڑ دی اور وہ اَن چاہا مشکلات ومصائب میں گھرتے چلے گئے۔

بحیثیت انسان نواز: اِس سے قطع نظر کہ اعظم کُریوی بچپن میں ضدی اور غصہ ورطبیعت کے مالک تھے، جیسے جیسے عمر بڑھتی گئی اُن کے اندر انسان دوستی اور احباب نوازی کا جذبہ بڑھتا گیا۔ چناں چہ جو کبھی بچوں کے شوروغوغا سے گھبرایا کرتے تھے اور کبھی کبھی بچوں کو اُن کی شرارتوں پر اُنھیں طمانچے بھی ماردیا کرتے تھے۔ایک وقت ایسا بھی آیا کہ وہ اُنھیں پوتوں اور نواسوں کے ساتھ وقت گزارنے لگے۔ پھر اُن کی یہ محبتیں اور شفقتیں صرف اپنوں تک ہی محدود نہیں رہیں بلکہ زندگی میں جو کوئی بھی ایک باراُن سے مل لیا، یا اتفاقاً کسی سے کبھی کوئی ملاقات ہوگئی تو بھی اُس کو ہمیشہ یاد رکھتے اور جب دوبارہ اُس سے ملاقات ہوتی تو اُس کے ساتھ بڑی محبت سے پیش آتے۔شاہد احمد دہلوی مدیر ماہنامہ''ساقی'' کراچی کے بقول: اتفاق سے اُن سے پہلی ملاقات میرٹھ کے نوچندی میں ہوئی۔ تعارف ہوتے ہی گلے سے لگایا کہ نہ جانے کب کے تر سے بچھڑے ہوئے تھے۔ پھر اُس پر سخت مصر کہ نہیں، ابھی میرے ساتھ میرے گھر چلو۔ میرٹھ میں کہیں اور ٹھہرے ہی کیوں؟ بمشکل تمام انھیں اس پر رضامند کیا کہ کل دوپہر کو قافلہ آپ کے یہاں آئے گا اور خوب جی بھر کے باتیں ہوں گی۔ اگلے دن ہم ان کے گھر گئے تو ڈاکٹر صاحب خاطر ومدارات میں بچھے جاتے تھے اور بار بار شکوہ کرتے تھے کہ میرٹھ آپ آئیں اور کہیں اور ٹھہر جائیں؟ کئی گھنٹے اُن سے باتیں ہوتی رہیں۔شام کی گاڑی سے ہمیں دہلی جانا تھا۔ جب ہم چلنے لگے تو ڈاکٹر صاحب رنجیدہ ہو گئے اور اُس وقت تک ہمارا ساتھ نہ چھوڑا جب تک ہمارے تانگے روانہ نہیں ہو گئے۔(41)اور لوگوں سے راہ ورسم اور شناسائی پیدا کرنے میں بھی اعظم بڑے تیز واقع ہوئے تھے۔ راہ چلتے چلتے، بس یا ٹرم میں بیٹھے بیٹھے، اجنبی لوگوں سے اچھی خاصی جان پہچان بنا لیتے تھے۔ ٹیلیفون کرتے ہوئے کوئی غلط نمبر مل جاتا تو اکثر وبیشتر اس اتفاقیہ تقریب کو باقاعدہ تعارفی تقریب کے قالب میں ڈھال دیتے تھے اور کمال تو یہ تھا کہ ان لوگوں کو یاد بھی رکھتے تھے۔ البتہ! گہری دوستیاں قائم کرنے کی طاقت اُن میں نہ تھی لیکن جس کسی سے بھی اخلاص کا رشتہ ایک بار قائم ہو جاتا تو وہ دیدہ ودل اس کے سامنے فرش راہ کردیتے تھے۔(42)

حالاں کہ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ اعظم کریوی سخت مالی بحران کا شکار تھے پھر بھی اُنھوں نے احباب نوازی سے منھ نہیں موڑا۔ پُرانے تعلقات کے رکھ رکھاؤ، احترام اور وضع داری میں اپنی معذوریوں، مجبوریوں کو یکسر بھول جاتے تھے۔ایک مرتبہ کراچی سے اپنی سائیکل پر سوار واپس آئے اور کہنے لگے: بھائی صاحب! کل شام کا کھانا ہمارے یہاں کھایئے گا۔ خیرت تو ہے؟ میں نے تعجب سے پوچھا۔معلوم ہوا کہ ہندوستان کے ایک مشہور شاعر جو اِن دنوں کراچی آئے ہوئے تھے، اُنھیں کھانے پر مدعو کر آئے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اُن کے ساتھ 15 - 20 / دیگر اصحاب بھی، جو اُس وقت جناب شاعر کی خاطر داری میں مصروف تھے۔ فرمایا: مجھے معلوم ہے کہ اس ایک دعوت کا لایا ہوا قحط مہینوں اب میرے گھر میں رہے گا مگر بھائی صاحب! مدت کے بعد اُن سے ملاقات ہوئی ہے۔ ملنے چلا گیا تو آپ کیا کرتا... اُن سے کیا کہتا؟ (43) گویا اعظم کریوی کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ کوئی آدمی اُن کے قریب رہے اور اُن کے اخلاص، اُن کے انکسار، اُن کی ہمدردی اور تعلقات میں اُن کی گرمجوشی سے متاثر نہ ہو پائے۔ وہ جس کسی کے قریب جانا چاہتے تو اِنتہائی کشادہ دلی سے اپنے آپ کو اُس کے سپرد کر دیتے۔ اُن کی شخصیت شہد اور موم کی بنی ہوئی تھی۔ میں نے کبھی ایک سنگریزے کی کسک بھی اُن میں محسوس نہیں کی۔ مزاج ایسا پایا تھا کہ اس مزاج کا آدمی جہاں کہیں بھی مل جائے تو اُسے اٹھا کر دفتر میں رکھ لینا چاہیے، مثلاً: ملائم، متحمل اور معاملہ فہم۔ (44) اور اِن تمام باتوں کے پیچھے اُن کی غیر معمولی ذہانت کارفرما تھی۔ وہ جب بھی کوئی رائے دیتے تو بڑے سلیقے سے دیتے۔ ضمیر جعفری بتاتے ہیں کہ معاملات پر اپنی ایک رائے بھی رکھتے، موقع محل دیکھ کر اُس کا اظہار بھی ضرور کرتے، مگر سب کچھ اِس سلیقے کے ساتھ کہ گویا اپنی کوئی رائے ہی نہیں۔ کوشش یہ ہوتی کہ ڈائریکٹر صاحب (حفیظ جالندھری) اُن کی رائے خود اپنی رائے سمجھ کر اُس پر عمل کریں۔ وہ اپنے نقطۂ نظر کو واشگاف الفاظ میں بیان نہیں کرتے تھے، بلکہ افسر کو گھیر گھار کر اُس تک لے آتے تھے۔ اپنے کام کی اہمیت، اس کی مقدار و معیار پر روشنی ڈالنے کا ملکہ اُن میں وافر انداز میں تھا۔ (45)

اعظم کُریوی کی انسان دوستی کے شاہد وہ خطوط بھی ہیں جو اُنھوں نے اپنے احباب اور متعلقین کو لکھے ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ اُن کے خطوط، مجموعہ کی شکل نہ پا سکے اور اگر کچھ شائع بھی ہوئے تو اُنھیں قابل اعتنا نہ سمجھا گیا۔ مختلف مواقع پر شاہد احمد دہلوی اور اعظم کُریوی کے مابین مراسلاتی تعلقات قائم رہے، چناں چہ وہ بیان کرتے ہیں کہ اُن (اعظم کریوی) کے خطوط سے بڑی محبت ٹپکتی تھی۔ (46) انھوں نے وقتاً فوقتاً یوسف کمال ناروی کے نام بھی کئی خطوط لکھے جن سے اُن کی شخصیت پر بخوبی روشنی پڑتی ہے۔ مثال کے طور پر 23 / ستمبر 1944ء کے اپنے ایک خط میں وہ لکھتے ہیں: والد صاحب، والدہ صاحبہ، محسن صاحب، مرشد، نور مرشد، ماسٹر صاحب، بڑے بابو کو سلام، بچوں کو پر خلوص دعائیں۔ (47) اور 13 / دسمبر 1944ء کو ایک دوسرے خط میں لکھا کہ میری بیگم آپ کو دعا کہتی ہیں۔ بچے سلام عرض کرتے ہیں۔ نمبر دار بحساب عمر بچوں کے نام سن لیجیے: افتخار احمد، زینت النساء، تہذیب النساء، نیر اعظم، نیر اعظم سب سے چھوٹے ہیں۔ قیصر و توصیف سلمہ کو بہت بہت دعائیں۔ ہاں! میں نے دریافت کیا تھا کہ والد صاحب کا جو تبادلہ کلکتہ ہو گیا تھا وہ منسوخ ہوا، یا نہیں؟ مگر آپ نے اب تک کوئی جواب نہیں دیا۔ میری طرف سے والدہ صاحبہ، والد صاحب، مرشد، محسن صاحب، نور جہاں، ماسٹر صاحب، بڑے بابو، ڈرائیور صاحب و جملہ پُرسان حال کو سلام۔ (48) اِس طرح سے نام بنام سلام و دعائیں بھیجنا، یہاں تک کہ ڈرائیور کو بھی سلام، اعظم کُریوی کی انسان دوستی کی واضح دلیل ہے۔

مذہب وملت نوازی: اعظم کُریوی کی پیدائش اور تعلیم و تربیت جس خاندان میں ہوئی اُس کا ماحول مذہبی اور دینی تھا۔ اُنھوں نے اپنے خاندان کو حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی قدس سرہٗ سے منسوب کیا ہے جو اَپنے وقت کے جید عالم دین اور شریعت و طریقت کے امام تھے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو مذہبی اور دینی رجحان اُن کو وَرثے میں ملا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ پختہ مذہبی اور دیندار طبیعت کے مالک تھے۔ اسلامی عقائد سے اُنھیں بڑی رغبت تھی اور مذہبی اکابرین سے بھی اُنھیں خاصہ لگاؤ تھا، بلکہ وہ اسلامی احکام وشعائر کے مطابق زندگی گزارتے تھے۔ منقول ہے: دوسری عالمی جنگ (1943 - 1944ء) کے وقت اُن کا تبادلہ بنگال میں کر دیا گیا۔ وہاں سے محمد یوسف کمال ناروی کی درخواست پر اُن سے ملنے کے لیے بنڈیل جنکشن، ناروی صاحب کے گھر گئے۔ اس وقت وہ انگریزی پتلون میں تھے لیکن پتلون کے نیچے چوڑی دار پائجامہ پہن رکھا تھا۔ جب نماز کا وقت ہوا تو اُنھوں نے پتلون نکال دی اور چوڑی دار پائجامہ میں نماز ادا کر لی۔ اِس طرح اُنھیں نماز ادا کرنے میں کوئی قباحت اور دقت نہیں ہوئی۔ (49) حکیم اسرار احمد کریوی لکھتے ہیں کہ اعظم کریوی بڑے خشوع و خضوع سے نماز ادا کیا کرتے تھے اور سورۂ یٰس کی تلاوت باقاعدگی سے کیا کرتے تھے۔ (50) ناہید اعظم

کا کہنا ہے کہ اُن کوشہدائے کربلا سے بھی بڑی عقیدت تھی اور اِس کا واضح ثبوت سات اشعار پر اُن کا ایک ''سلام'' ہے جو ماہنامہ ''اخبار اعظم'' کراچی، جون۔جولائی 1990ء کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔یہ مذہبی وملی جذبہ ہی تھا کہ اُنھوں نے ''ایودھیا مسجد'' پر ایک تفصیلی مضمون لکھا، اور اُس میں ہندو۔مسلم تنازع، مسجد کی تاریخ اور حکومت کی سستی وکاہلی اور اُس کی جانب داری وتعصب کونمایاں کیا۔یہ مضمون ''خلافت'' میں 1937ء میں شائع بھی ہوا تھا۔سال 1955ء میں جب اعظم کُریوی ایک جانکاہ حملے میں اِس دنیا سے چل بسے تو اُس وقت خراج عقیدت کے طور پر ''خلافت'' کے ایڈیٹر رئیس احمد جعفری نے اُن کی شخصیت پر ایک مضمون بنام ''ڈاکٹر اعظم کریوی مرحوم'' لکھا تو اُس میں اُنھوں نے ایودھیا مسجد پر مشتمل مضمون کے بارے میں بالتفصیل ذکر کیا، وہ لکھتے ہیں: ''اجودھیا کی مسجد کا ہنگامہ چل رہا تھا۔یہ واقعہ غالباً 1937ء کا ہے۔میں ''خلافت'' کا ایڈیٹر تھا۔اُس مسجد سے متعلق ایک مفصل مقالہ جو بہترین معلومات پر مشتمل تھا۔جس میں مسجد کی تاریخ، ہندو مسلم تنازع کی تاریخ، حکومت کے تساہل اور جانب داری کی مستند اور مفصل تاریخ درج تھی، میرے پاس آیا۔نیچے اعظم کریوی کے دستخط تھے۔میں نے اُسے پڑھا اور نمایاں طور پر ''خلافت'' میں شائع کیا۔پھر اُسی پر پے در پے مقالاتِ ادارت لکھے۔حکومت نے ضمانت طلب کرنے کی تیاریاں کیں لیکن کیس اتنا مضبوط تھا کہ نہ کرسکی۔مضمون نگار کا نام معلوم کرنا چاہا۔میں نے بتانے سے انکار کردیا۔مراسلہ مانگا۔میں نے کہا وہ ضائع ہوگیا۔ڈاکٹر صاحب فوج میں ملازم تھے۔میرے اِس طرزِ عمل سے بہت متأثر ہوئے۔یہ واقعات اُن کے علم میں آچکے تھے۔محبت بھرے خط آنے لگے...'' (51) ''خلافت'' کے ایڈیٹر محترم رئیس جعفری کی مذکورہ تحریر سے اعظم کریوی کی مذہبی وملی جذبے کے ساتھ اُن کی حق گوئی اور بے باکی کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

حب الوطنی: شاہد احمد دہلوی کے مطابق اعظم کُریوی نے عرصۂ دراز تک دیہات میں زندگی گزاری اور ڈاکٹر حامد کمال ناوری کا یہ کہنا کہ اعظم کُریوی زیادہ تر اپنے وطن سے باہر رَہے اور شہر میں اُن کا وقت زیادہ گزرا۔اِن دونوں باتوں میں مطابقت تلاش کرنے کے بجائے یہاں یہ دیکھنا اہم ہے کہ اعظم کُریوی کو اپنے وطن اور گاؤں سے کس قدر محبت تھی اور اُنھیں علاقہ اور علاقہ کے باشندوں کا کس قدر خیال تھا؟ اب چاہے وہ دیہات میں زیادہ رہے ہوں یا شہر میں، بہرصورت اُنھیں اپنے وطن اور گاؤں سے حد درجہ محبت تھی۔یہی وہ اصل وجہ ہے کہ اُنھوں نے اپنے قلمی نام ''اعظم'' کے ساتھ اپنے گاؤں ''کُرئی'' کی نسبت کے باعث ''کُریوی'' لکھنا شروع کیا۔اِس سے تعلق ایک مرتبہ شاعر نوح ناروی نے اعظم کریوی سے دریافت کیا:

> ''اعظم! اپنے نام کے ساتھ ''کُریوی'' کیوں لکھتے ہو؟ تو اُنھوں نے جواب دیا: اُستاذ! میں چاہتا ہوں کہ میرا گاؤں پوری دنیا میں مشہور ہو، اور ایک دن دیکھئے گا کہ میرے گاؤں کا نام پوری دنیا میں ضرور مشہور ہوگا۔''

اور آج اُن کا یہ کہنا سچ ثابت ہو رہا ہے کہ آج ایک معمولی گاؤں ''کرئی'' دنیا میں معروف ہے۔نیز اس میں دو رائے نہیں کہ اعظم کُریوی تعلیم وتعلّم یا پھر ملازمت کے سلسلے میں اپنے وطن سے باہر رہے، مگر وہ ہمہ دم اپنی وطن دوستی کا ثبوت فراہم کرتے رہے۔مثلاً جب بھی وہ کچھ تحریر کرتے تو اُس تحریر کے آخر میں اپنے گاؤں کا نام ضرور لکھتے۔چناں چہ جب ''ہندی شاعری'' کا دیباچہ لکھا تو اُس کے خاتمے میں اپنا نام اور اپنے گاؤں کا نام اِس نہج پر لکھا:

اعظم کریوی
کورئی، الہ آباد
25 اگست 1928ء

جب کہ اُس وقت اعظم کریوی کی پوسٹنگ ''کوئٹہ'' میں تھی، لیکن پھر بھی اُنھوں نے اپنے نام کے ساتھ ''کوئٹہ'' کی جگہ اپنے چھوٹے سے گاؤں ''کُرئی'' کا نام لکھا جو اُن کے آبائی وطن سے بے لوث محبت اور مثالی لگاؤ کی دلیل ہے۔اُسی طرح اپنے افسانہ ''پریم کی لیلا'' میں اپنے وطن کا ذکر اس طور پر کیا ہے کہ گویا اُن کا گاؤں نہایت ہی مشہور ومعروف گاؤں میں سے ایک ہو، مثلاً: ''کورئی گھاٹ کے پاس گنگاجی کے کنارے الہ آباد کے ضلع میں ایک گاؤں رام چورا ہے۔'' یہاں ''کورئی گھاٹ'' کے ذکر کی کوئی ضرورت نہیں تھی، کیوں کہ ''کورئی گھاٹ'' کے بالمقابل ''گنگاجی''، ''الہ آباد'' اور ''رام چورا'' زیادہ مشہور تھا۔بلکہ صرف اتنا کہہ دینا بھی کافی تھا کہ ''گنگاجی کے کنارے الہ آباد ضلع میں ایک گاؤں رام چورا ہے۔'' لیکن اعظم کریوی نے اپنے غیر معروف گاؤں کو بھی اِس طرح پیش کیا کہ جیسے وہ کوئی مشہورِ عالم گاؤں ہو۔یہ بھی اپنے گاؤں اور وطن سے اُن کی محبت کی واضح دلیل ہے۔

ملازمت کے سلسلے میں اعظم کریوی ملک کے مختلف گوشوں میں رہے، لیکن جہاں کہیں بھی رہے وطن اور گاؤں کی یاد اُنھیں ستاتی رہی۔یہی وجہ

ہے کہ جب جہاں اُنھیں اظہار کا موقع ملا اپنے گاؤں سے محبت اور وطن دوستی کا مظاہرہ کر بیٹھے۔ خواہ نثر کے توسط سے ہو یا نظم کی توسط سے، مثلاً:

اعظم تمام عمر غریب الوطن رہا
خانہ بدوش ہوں کہیں دنیا میں گھر نہیں

وطن میں عید نہ منا پانے پر اَپنے غم کا اظہار کچھ اس انداز سے کرتے ہیں:

ہم تو ہیں پردیش میں اعظم منائیں عید کیا
دید کے قابل مگر اہل وطن کی عید ہے

اعظم کُریوی کے کئی خطوط ایسے بھی ہیں جن سے اُن کی وطن دوستی ظاہر ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر 13/دسمبر 1944ء کو اُنھوں نے ایک خط محمد یوسف کمال ناروی کے نام لکھا۔ اُس میں وہ لکھتے ہیں کہ سخت انتظار کے بعد نارہ شریف کا چلا ہوا خط مجھے یہاں ملا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ آپ اب تک وطن کی فضاؤں سے لطف اندوز ہو رہے ہوں گے۔ چناں چہ میں بغرض یاد دہانی خط لکھنے ہی والا تھا کہ آپ کا گرامی نامہ مل گیا۔ بہت خوشی ہوئی۔

پھر 20/اگست 1946ء کو اَنبالہ چھاؤنی سے محمد یوسف کمال ناروی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں کہ آپ کا 17/اگست کا کارڈ ملا۔ آخر آپ ہگلی سے جو پھسلے لب گنگا پہنچے۔ وطن پہنچ ہی گئے۔ اِس سے بڑھ کر کیا خوشی ہو سکتی ہے۔ والد صاحب بھی فیض آباد آ گئے۔ یہ سب اللہ کا فضل و کرم ہے۔ بنڈیل ہزار رُومانی مقام ہو مگر ''حب وطن از ملک سلیماں خوش تر''۔ اب آپ الہ آباد آ گئے ہیں تو آپ سے ان شاء اللہ جلد جلد ملاقات ہوتی رہے گی۔ یہاں کا موسم خوش گوار ہے، میرے الہ آباد کا کیا حال ہے؟ (52)

خلاصہ یہ کہ اپنے وطن سے ایسی محبت کون کر سکتا ہے۔ اعظم کریوی نے یہ نہیں لکھا کہ ''الہ آباد'' کا کیا حال ہے؟ بلکہ یہ لکھا ہے کہ ''میرے الہ آباد'' کا کیا حال ہے؟ الہ آباد کے ساتھ ''میرے'' کا لفظ وجدانی کیفیت کا مظہر ہے۔ (53) لیکن یہ کون جانتا تھا کہ ایک دن وہ بھی آئے گا کہ اعظم کریوی نہ صرف اپنے وطن سے دور ہو جائیں گے بلکہ اپنے گاؤں اور وطن کی گود میں سونے کے بجائے دیارِ غیر میں ایک مہاجر کی طرح دنیا سے رخصت ہوں گے۔

تحریک آزادی: ایک غیور قوم اور سچے ہندوستانی کی طرح اعظم کُریوی بھی آزادی کے حامی اور دلدادہ تھے۔ انگریز اُنھیں ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ملازمت میں جو ترقی اُنھیں ملنی چاہیے تھی وہ نہ مل سکی، کیوں کہ اعظم کُریوی دفتر میں بھی انگریزوں اور اُس کے بہی خواہوں کے آداب و تعظیم اُن کی مرضی کے مطابق نہیں کر پاتے تھے، اور کبھی کبھی نوبت تو اِس حد تک پہنچ جاتی تھی کہ اعظم کُریوی انگریز افسروں سے بھڑ بھی جاتے تھے۔ سرکاری ملازم ہونے کے باوجود اعظم کُریوی خفیہ طور پر قومی اور ملی سرگرمیوں میں حصہ لیتے رہے۔ خود بھی ولایتی سامان سے احتراز کرتے اور دوسروں کو بھی اِس بات کی ترغیب دیتے کہ وہ لوگ بدیسی سامان کے بجائے دیسی سامان استعمال کریں اور بدیسی دکانوں کے بجائے دیسی دکانوں سے چیزیں خریدیں۔ انگریز بیزاری اور آزادی کی خواہش صرف اُن کے قلب کے اندر ہی نہیں تھی بلکہ یہ سب باتیں اُن کی تحریروں اور افسانوں میں بھی باقاعدگی سے نظر آتی ہیں۔ اِس تعلق سے اُن کے افسانے ''انقلاب''، ''کرنی کا پھل'' وغیرہ بطور مثال پیش کیے جا سکتے ہیں۔

ڈاکٹر اعظم کُریوی ویسے تو مطلق انگریز سے نالاں تھے، لیکن بالخصوص اُن کی بدسلوکی اور ہندوستانیوں کے ساتھ ان کا غیر انسانی رویہ اُنھیں بالکل پسند نہیں تھا۔ ان کے متعدد افسانے ایسے ہیں جن میں اُنھوں نے انگریزوں کی بدسلوکیوں اور اُن کی غیر انسانی حرکتوں کو عوام الناس کے سامنے واضح طور پر پیش کیا ہے۔ چناں چہ اپنے ایک افسانے میں وہ لکھتے ہیں کہ سرکاری ملازم ہو کر بھی وہ پوشیدہ طور سے ملی اور قومی کاموں میں بہت حصہ لیتے۔ ولایتی دکانوں کے بجائے وہ ہمیشہ دیسی سے سودا سلف خریدتے تھے۔ ونے کرشن ایسے مشہور لیڈر کا درشن کرنے کے لیے ڈاکٹر صاحب آگے بڑھے۔

انگریزوں کا جو گھٹیا رویہ ہندوستانیوں کے ساتھ جاری تھا اُس پر روشنی ڈالتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ کلکتہ جانے والی گاڑی پلیٹ فارم کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی اور وِنے کرشن دوسرے درجے میں بیٹھنے کے لیے بڑھے، جیسے ہی وہ کھڑکی کھول کر کمرے میں داخل ہونے لگے اندر بیٹھے ایک یورپین صاحب بہادر نے ڈانٹ کر کہا: ''یو، کالا آدمی کی گاڑی نہیں۔'' وِنے کرشن نے کہا: ''کیوں، میرا روپیہ بھی کالا ہے؟ میرے پاس سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ ہے۔''

ایک تو حکم نہ ماننا اور دوسرے گستاخانہ جواب ایک کالے آدمی کی طرف سے سفید چمڑے والا نہ سہن کر سکا۔ اُٹھا اور دھوتی قمیص ریشمی چادر اوڑھنے والے سوراجی لیڈر کو پلیٹ فارم پر ڈھکیل دیا، اور اِس کے ری ایکشن میں اسٹیشن پر اُس انگریز کی جو درگت بنی اُس کے بارے میں وہ لکھتے ہیں: جو والنٹیئر اور قوم پرست لوگ وِنے کرشن کو پہنچانے آئے تھے وہ سب اُن کی بے عزتی ہوتے دیکھ کر آپے سے باہر ہو گئے۔ والنٹیئروں نے بندے

ماترم کا نعرہ لگایا اور دو تین آدمی کمرے میں گھس کر صاحب بہادر کو باہر کھینچ لائے اور چاروں طرف سے بے بھاؤ کے پڑنے لگے۔شور وغل سن کر اس طرف گارڈ آ رہا تھا وہ صاحب بہادر کی گت دیکھ کر چپ چاپ بریک وان میں گھس گیا، بڑی مشکل سے سمجھ دار لوگوں نے صاحب بہادر کو بچالیا۔(54)

یہ تمام مناظر دراصل اعظم کریوی کی آزادی کی حمایت اور انگریز سے نفرت کو بیان کرتا ہے۔مذکورہ افسانے میں اعظم کریوی نے اپنے دلی جذبات اور چشم دید حال پیش کیا ہے کہ کس طرح قومی وملی پروگرام میں وہ چھپ چھپا کر حصہ لیتے ،مجاہد آزادی سے ملاقات کرتے (جیسا کہ و نے کرشن سے ملاقات کی)،اور اِس طرح ملازمت میں رہتے ہوئے ملکی وملی مفاد کے لیے سرگرمِ عمل رہے۔

❀❀❀

مصادر و مآخذ

(1۔2)ماہنامہ اخبار اعظم،کراچی،اعظم کریوی نمبر،جون وجولائی،1990ء،ص:62

(3۔6)اردو افسانے کی تشکیلی روایت میں اعظم کریوی کا حصہ،باب:2،فصل:4(قلمی نسخہ)

(7)ماہنامہ اخبار اعظم،اعظم نمبر،جون۔جولائی،1990ء،ص:62

(8۔9)میرا پسندیدہ افسانہ،ص:105،مصنفہ بشیر ہندی بحوالہ اخبار اعظم،کراچی

(10۔13)ماہنامہ اخبار اعظم،اعظم نمبر،جون۔جولائی،1990ء،ص:62

(14)میرا پسندیدہ افسانہ،ص:106،مصنفہ بشیر ہندی بحوالہ اخبار اعظم،کراچی،1990ء

(15)اُردو افسانے کی تشکیلی روایت میں اعظم کریوی کا حصہ،باب:2،فصل:4(قلمی نسخہ)

(16)ماہنامہ اخبار اعظم،اعظم کریوی نمبر،جون۔جولائی،1990ء

(17)اُردو افسانے کی تشکیلی روایت میں اعظم کریوی کا حصہ،باب:2،فصل:4(قلمی نسخہ)

(18)ماہنامہ نیرنگ خیال،سالنامہ نمبر،دسمبر 1934ء،ص:30

(19-21)اُردو افسانے کی تشکیلی روایت میں اعظم کریوی کا حصہ،باب:2،فصل:4(قلمی نسخہ)

(22-25)ماہنامہ ساقی کراچی،نومبر،1955ء،ص:31-32

(26)اردو افسانے کی تشکیلی روایت میں اعظم کریوی کا حصہ،باب:۲،فصل:۴(قلمی نسخہ)

(27)ماہنامہ ساقی کراچی،نومبر،۱۹۵۵ء،ص:۳۲-۳۱

(28۔29)اردو افسانے کی تشکیلی روایت میں اعظم کریوی کا حصہ،باب:2،فصل:4(قلمی نسخہ)

(30۔31)ماہنامہ ساقی کراچی،نومبر،1955ء،ص:32

(32۔35)ماہنامہ ساقی کراچی،نومبر،1955ء،ص:33

(36-37)اردو افسانے کی تشکیلی روایت میں اعظم کریوی کا حصہ،باب:2،فصل:4(قلمی نسخہ)

(38-39)ماہنامہ ساقی کراچی،نومبر،1955ء،ص:32

(40)حوالہ سابق،ص:34

(41)حوالہ سابق،ص:12

(42)حوالہ سابق،ص:34

(43۔45)حوالہ سابق،ص:33

(46)حوالہ سابق،ص:12

(47۔49)اردو افسانے کی تشکیلی روایت میں اعظم کریوی کا حصہ،باب:2،فصل:4(قلمی نسخہ)

(50)ماہنامہ اخبارِاعظم، کراچی، جون۔جولائی، 1990ء،ص:26

(51)روزنامہ زمیندار، لاہور، 27/جون 1955ء

(52۔53)اردو افسانے کی تشکیلی روایت میں ڈاکٹر اعظم کریوی کا حصہ، ص: 320-321

(54)افسانہ ''کرنی کا پھل''

سوانحی کوائف

ڈاکٹر جہاں گیر حسن کا تعلق صوبہ بہار کے ضلع مشرقی چمپارن سے ہے۔ 9/دسمبر 1980ء کو بمقام ہروہانی، ڈھاکہ، مشرقی چمپارن اپنے نانیہال میں پیدا ہوئے اور پرورش و پرداخت بمقام حسن پور، بسبٹا بازار، ضلع سیتامڑھی دادیہال میں ہوئی۔ پرورش و پرداخت اور تعلیم وتربیت جدِ امجد ولی محمد رحمہ اللہ کی مرہونِ منت ہے۔ پرائمری تعلیم وتربیت محلہ ہی کے مدرسے الجامعۃ العربیہ رضاء العلوم، حسن پور میں ہوئی۔ یہ مدرسہ جدِ امجد کی تحریک پر قائم کیا گیا تھا۔ بعدۂ الجامعۃ الاسلامیہ رضاء العلوم، کنہواں (سیتامڑھی، بہار) میں داخل ہوئے اور مولانا حامد رضا اور مولانا عبدالحمید نوری رحمہما اللہ وغیرہ سے گلستاں و بوستاں کا درس لیا۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے جامعہ امجدیہ، گھوسی اور جامعہ اشرفیہ، مبارکپور پہنچے اور 1997ء میں جامعہ اشرفیہ سے سندِ فضیلت حاصل کی۔ 2003 میں جامعہ ملیہ، نئی دہلی سے بی اے اور 2005 میں دہلی یونیورسٹی سے ایم اے اور 2006ء میں پی جی ڈپلوما اِن ماس میڈیا کی ڈگری حاصل کی۔ جامعہ ملیہ سے 2009ء میں ایم افل اور 2016ء میں ڈاکٹریٹ کی سند سے سرفراز کیے گئے۔ اِس میں درمیان کچھ وقت (2009۔2010ء) کے لیے عارضی طور پر پٹنہ مسلم ہائی اسکول، پٹنہ میں بحیثیت اُردو اُستاذ تدریسی خدمات پر مامور رہے۔ عہدِ طالب علمی سے ہی تحریر وقلم کا ذوق رکھتے ہیں۔ اُس وقت سے اب تک دینی وعلمی اور سیاسی وسماجی موضوعات پر مسلسل لکھ رہے ہیں۔ زود نویس بھی ہیں اور خوب نویس بھی۔ سیکڑوں مضامین ومقالات متعدد اخبارات ورسائل میں شائع ہو چکے ہیں اور یہ سلسلہ ہنوز جاری وساری ہے۔ 2012ء میں خانقاہ عارفیہ، سید سراواں، الہ آباد سے منسلک ہوئے اور ماہنامہ ''خضرِ راہ'' کے مدیر ہوئے اور تاحال اِدارت کے ساتھ ساتھ جامعہ عارفیہ میں درس وتدریس کے فرائض پر مامور ہیں۔

مراسلت کا پتا:

(ڈاکٹر) محمد جہاں گیر حسن

شاہ صفی اکیڈمی/ جامعہ عارفیہ، سید سراواں، ضلع کوشامبی (یوپی) پن کوڈ: **212213**

Dr. Md Jahnagir Hasan

Shah Safi Academy/Jamia Arifia

Saiyed Sarawan, Kaushmabi (U.P.)

Pin. 212213

E-mail:- mjhasan2009@gmail.com

Mobile: 9910865854/9794364306